سید امیر علی
ترجمہ:۔ محمد ہادی حسن

دُنیائے قبل از اِسلام پر ایک نظر[1]

نوعِ انسانی کی ذہنی ترقی میں جو تسلسل پایا جاتا ہے وہ ایک ایسا موضوع ہے جو انسان کا مطالعہ کرنے والوں کے لیے انتہائی دلچسپی رکھتا ہے۔ نفسِ انسانی کا تدریجاً ایک ہمہ گیر ذات، ایک محیطِ کائنات ارادے کو پہچاننا! اندھیرے میں بھٹکتے پھرنے کی جو زحمتیں کیا افراد اور کیا اقوام دونوں نے جھیلی ہیں، اس سے پیشتر کہ اُن کے ذہنوں پر ایک ایسی رُوحِ مطلقہ کا تصور جلوہ گر ہوتا جو تمام موجودات میں جاری وساری اور نظامِ فطرت کو قاعدہ وقانون کے سانچے میں ڈھالنے والی ہیں۔ یہ ایسی چیزیں ہیں جن سے نہایت معنی خیز سبق حاصل ہوتے ہیں۔ بارہا ایسا ہوا ہے کہ جس عمل کے ذریعے نوعِ انسانی اشیائے مادی کی پرستش سے ترقی کر کے عبادتِ الٰہی تک پہنچی ہے وہ معرضِ تصدیق میں پڑ گیا۔ اقوام اور افراد کثیر تعداد میں شاہراہِ ترقی سے منحرف ہو گئے اور اپنی خواہشاتِ نفسانی کے عزلِ راہ کا دھوکا کھا کر اپنے عہدِ طفولیت کے بُتوں کی طرف لوٹ گئے، جو محض اُن کے جذبات کے تراشے ہوئے مجسمے تھے۔ لیکن خدا کی آواز، چاہے کوئی اُسے سُنتا یا نہ سُنتا، ہمیشہ دعوتِ حق دیتی رہی ہے اور وقت آنے پر اس کے بندگانِ خاص نے اُٹھ کر اعلان کیا ہے کہ انسان پر دوسرے انسانوں کی طرف سے اور اس کے پیدا کرنے والے کی طرف سے کیا کیا فرائض عائد ہوتے ہیں۔ یہ بندگانِ خاص خدا کے حقیقی پیغمبر تھے۔ وہ اپنی قوموں میں اپنے وقت کی پکار بن کر آئے، جس میں سچائی، پاکبازی اور انصاف کے وہ تمام ولولے تڑپ رہے تھے جو رُوحِ انسانی میں ودیعت کیے گئے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک اپنے زمانے کے رُوحانی تقاضوں کا ترجمان تھا! ہر ایک اس لیے آیا کہ ایک گری ہوئی قوم کو سدھارے، نکھارے اور اُبھارے اور ایک بگڑی ہوئی مملکت کو بنائے۔ بعض ایک محدود تمدن کی تعلیم دینے کے لیے آئے، جو ایک چھوٹے سے دائرے کے اندر محصور رہا۔ دوسرے ایک عالم گیر پیغام لے کر آئے، ایک ایسا پیغام جو کسی ایک نسل یا قوم کے لیے نہ تھا

---

[1] ادارہ ثقافتِ اسلامیہ سید امیر علی مرحوم ومغفور کی شہرۂ آفاق انگریزی تصنیف سپرٹ آف اسلام کا اُردو ترجمہ شائع کر رہا ہے۔ مترجم جناب ایم ہادی حسن صاحب ہیں۔

بلکہ ساری نوعِ بشر کے لیے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا شمار مؤخر الذکر زمرے میں ہوتا ہے۔ آپ کا پیغام صرف عربوں کے لیے نہ تھا۔ آپ صرف ایک زمانے یا ملک کے لیے مبعوث نہ ہوئے تھے، بلکہ سارے بنی آدم کے لیے، اس دُنیا کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک جتنے بندگانِ خدا ہیں اُن سب کے لیے۔ اس معلمِ اعظم کا ظہور جس کے سوانح حیات اُس کی بعثت کے لمحے سے لے کر آخر تک مصدقہ طور پر قلمبند ہو چکے ہیں محض ایک اتفاقی حادثہ یا تاریخ عالم کے حاشیے پر لکھا ہوا ایک غیر متعلق اور ضمنی واقعہ نہ تھا۔ وہ اسباب، وہ زبانِ حال سے پکارتی ہوئی خرابیاں، ساری کائنات میں جاری و ساری ایک قدرتِ مطلقہ پر یقینِ محکم پیدا کرنے کے وہ اندرونی داعیے جو قیصر آگسٹس کے زمانے میں گلیلی کے کنارے ایک ایسے پیغمبر کو وجود میں لائے تھے، جس کی زندگی ایک المیہ تھی، وہی ساتویں صدی عیسوی میں دوبارہ بروئے کار آئے، اور اب کی پہلے سے بھی زیادہ قوت کے ساتھ۔ جیسا کہ بجا طور پر کہا گیا ہے، ساتویں صدی عیسوی کا آغاز قومی، معاشرتی اور مذہبی انتشار کا زمانہ تھا۔ اُس میں جو مظاہر رونما ہوئے وہ ویسے ہی تھے، جیسے مثبت ایمان و ایقان کے کسی نئی صورت میں جلوہ گر ہونے کا باعث بنتے ہیں، تاکہ آوارہ و سرگرداں قوتوں کو مذہبی ارتقا کے اُس ناگزیر راستے پر لایا جائے، جس کی منزلِ مقصود ذاتی عبادت کی تکمیل و تنظیم ہے۔ یہ تمام مظاہر کس پر دلالت کر رہے تھے کہ یہودیت اور عیسائیت نے خدا کی مملکت کا جو نقشہ پیش کیا ہے اُس سے کسی زیادہ مربوط مرقع کا صورت پذیر کیا جانا ضروری تھا۔ زرتشت، حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ نے جو شمع روشن کی تھی اس کی لو انسانی خون کے چھینٹوں سے بجھائی جا چکی تھی۔ ایک بگڑی ہوئی زرتشتیت نے اور ایک اُس سے بھی زیادہ بگڑی ہوئی عیسائیت نے، جو ایک دوسرے سے برسرِ پیکار تھیں، انسانی ضمیر کی ناطقہ بندی کر رکھی تھی اور کرۂ ارض کے بعض شادماں ترین خطوں کو لہو کی ندیوں کا سنگم بنا رکھا تھا۔ بالادستی کی خاطر مسلسل رزم آرائیوں، دائمی خانہ جنگیوں اور مذہبوں اور فرقوں کی لگاتار چپقلشوں نے قوموں کا خونِ زندگی نچوڑ دیا تھا، اور روئے زمین کے باشندے، جو ایک بے جان مشائخ پرستی کی آہنی ایڑیوں سے کچلے جا رہے تھے، خدا سے اپنے آقاؤں کے مظالم کی فریاد کر رہے تھے۔ دنیا کی تاریخ میں ایک نجات دہندہ کی اس سے زیادہ ضرورت کبھی لاحق نہ ہوئی تھی اور نہ کبھی اس کے ظہور کے لیے اس سے موزوں تر وقت آیا تھا۔ چنانچہ محمد صلعم نے دُنیائے اخلاق میں جو کچھ کر دکھایا اس کا صحیح صحیح اندازہ لگانے کی خاطر ضروری ہے کہ اسلام سے پہلے اور طلوعِ اسلام کے وقت اقوامِ عالم کے جو مذہبی اور معاشرتی حالات

تھے اُن پر ایک سرسری سی نظر ڈالی جائے۔

باختر (BACTRIA) کی سطح مرتفع، جسے عرب جغرافیہ دانوں نے اُم البلاد کا موزوں نام دیا ہے، نوعِ انسانی کا گہوارہ، مذہبوں اور قوموں کا مرزبوم، خیال کی جاتی ہے۔ نوعِ بشر کے بچپن پر تقابلی علم الاقوام جو مدھم سی روشنی ڈالتا ہے وہ روشنی میں ہمیں نسلِ انسانی کے اس ابتدائی مسکن میں خاندانوں کے چند چند گروہ دکھائی دیتے ہیں، جو رفتہ رفتہ ایک دوسرے سے ناتے جوڑ کر جرگوں اور قبیلوں کی شکل اختیار کرتے ہیں۔ اور پھر بڑھتی ہوئی آبادی کے دباؤ کے تحت موج در موج باہر نکل کر زمین کے مختلف خطوں کو آباد کرتے ہیں۔ سب سے پہلے جن لوگوں نے اپنے اس قدیم وطن کو خیرباد کہی، وہ غالباً حامی (HAMITIC) نسل کے لوگ تھے۔ اُن کے بعد جو لوگ نکلے وہ تورانی تھے یا، جیسا کہ انھیں کبھی کبھی ملقب کیا جاتا ہے اگرو فنی (UGRO-FINNISH) نسل کے لوگ، جو یافثی (JAPHETIC) خاندان کی ایک شاخ تھی۔ معلوم ہوتا ہے کہ ان میں سے بعض شمال کی طرف گئے اور پھر مشرق میں پھیل کر نوعِ انسانی کی موجودہ منگولی (MONGOLIAN) شاخ کے مورثِ اعلیٰ بنے۔ ایک اور شاخ مغرب کی طرف چل نکلی اور آذربائیجان، ہمدان اور گیلان میں آباد ہوگئی، جو بحیرۂ خزر کے جنوب اور جنوب مغرب میں ہیں اور جو تاریخِ قدیم میں ماد (MEDIA) کے نام سے نسبتاً زیادہ معروف ہیں۔ اس شاخ کے ایک حصے نے کچھ مدت کے بعد سرزمینِ بابل کے زرخیز میدانوں میں جاکر اپنے سے پہلے کی حامی نژاد آبادیوں کو مسخر کیا اور رفتہ رفتہ ان میں مل جل کر اکادی (ACCADIAN) قوم کی شکل اختیار کی، جسے یہودیوں اور عیسائیوں کی مذہبی کتابوں میں کوشی (KUSHITE) کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ اس مخلوط نسل نے بابل کی بنا ڈالی اور ایک ایسا مذہب ایجاد کیا جو اپنی بلند سطحوں پر فطرت پرستانہ وحدت الوجودیت سے مشابہ تھا۔ لیکن زیریں سطحوں پر اس میں ہمہ دیوتائیت (PANDAEMONIEM) کا عقیدہ تھا اور سورج دیوتاؤں اور چاند دیوتاؤں کی پوجا ہوتی تھی۔ ان چیزوں کے ساتھ ساتھ ننگ پوجا تھی، جنسی خواہشوں کی تسکین کرنے والی رسمیں تھیں۔ بعل اور (MOLOCH) دیوتاؤں پر بچوں کی قربانیاں تھیں، بلقیس (BELTIS) اور عشتورث (ASHTORETH) دیویوں پر کنواریوں کی بھینٹ چڑھانے کی ریت تھی۔ چنانچہ بابل کا مذہب ایک ایسے معاشرے کا مذہب تھا جس میں ایک طرف تو اعلیٰ درجے کی مادی ترقی تھی اور دوسری طرف پرلے درجے کی نفسانیت پرستی اور خون آشامی جیسے مذہب کی سندِ قبول حاصل تھی۔

اس کے بعد جس شاخ نے اُمّ البلاد سے کوچ کیا وہ سامی (SEMIETIC) نسل تھی۔ سامی بھی تورانیوں کے نقشِ قدم پر چل کر مغرب کی طرف گئے اور معلوم ہوتا ہے کہ بین النہرین (MESOPATOMIA) کے ڈیلٹے کے شمالی حصے میں آباد ہو گئے۔ بہت جلد انھوں نے تعداد اور قوت میں ترقی کر کے بابل کی سلطنت کا خاتمہ کر دیا اور اُس کی جگہ ایک وسیع سلطنت قائم کی، جس کا سکّہ تمام ہمسایہ ملکوں میں چلتا تھا۔ مغربی ایشیا کے دو بڑے دریاؤں کے درمیان اشوریوں (ASSYRIANS) نے جو دارالحکومت بنایا اُس میں جو مذہب رائج تھا وہ کبھی کبھی ایک مثبت تصورِ توحید کی بلندی تک جا پہنچتا تھا۔ ان کے یہاں جو سماوی سلسلۂ مراتب تھا اس میں ایک افضل و اعلیٰ ہستی کے صریح اعتراف کے نشان ملتے ہیں۔

ادھر ڈیلٹے کے شمالی حصے میں سامی نو آبادوں کی بڑی جماعت ترقی کے مراحل طے کر رہی تھی، ادھر سامیوں کا ایک چھوٹا سا گروہ اُر (UR) کے علاقے میں داخل ہو گیا، جو کلدانی[1] سلطنت کے زیرِ نگیں تھا۔ اس قبیلے کا شیخ، جس کی خود اختیاری جلاوطنی اور بادیہ گردی بہت سے مذہبوں کے قصّوں کا مضمون بن گئی ہے مستقبل کے تاریخ آفرینوں کا جدِ امجد بنا۔[2]

معلوم ہوتا ہے کہ یافثی شاخ دوسری تمام شاخوں کے چلے جانے کے بعد بھی اپنے اصلی وطن میں مقیم رہی۔ جس زمانے میں دوسری شاخیں اپنے اصلی تنے سے جُدا ہو کر سلطنتیں قائم اور مذاہب ایجاد کر رہی تھیں، اُسی زمانے میں یافثی شاخ اپنے طور پر نشو و نما پا رہی تھی۔ لیکن قوموں کی جادہ پیمائی جب ایک بار شروع ہو گئی تو پھر کہاں تھمتی تھی؟ یافثی قبیلے یکے بعد دیگرے مغرب کی طرف روانہ ہو گئے، نہ جانے اُس فطری بے چینی کے باعث جو وحشی قوموں کو ایک جگہ ٹکنے نہیں دیتی یا اس وجہ سے کہ ان کی آبادی اِتنی بڑھ گئی تھی کہ ان کی اصلی سرزمین اُن کے راعیانہ مشاغل کے لیے ناکافی ہو گئی تھی۔ جو لوگ سب سے پہلے نکلے اُن میں پیلیسجین (THE PELASGIANS) اور کلٹ (THE CELTS) تھے۔ اُن کے بعد دوسرے لوگوں نے بھی کوسِ رحلت بجایا تا آں کہ بالآخر صرف خالص آریہ لوگ اپنے قدیم مسکن میں باقی رہ گئے۔ اُن کا ایک گروہ بدخشاں کے نزدیک آباد تھا اور دوسرا بلخ کے نزدیک

---

[1] RAWLINSON ANCIENT MONARCHIES.

[2] عربی روایتوں میں حضرت ابراہیم کے باپ کا نام آذر بیان کیا گیا ہے جو صریحاً اشور کی ایک دوسری صورت ہے۔ آذر کے بنائے ہوئے خوب صورت بتوں کا ذکر اسلامی ادب میں اکثر آتا ہے۔ ان روایات سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیم اشوری النسل تھے۔

جہاں وہ ہمسایہ قوموں سے الگ تھلگ اور اُن کے جنگ و جدل اور نقل و حرکت سے کوئی سروکار رکھے بغیر صدیوں تک بود و باش کرتے رہے۔ تاریخ کی جو روشنی سلطنتوں اور تہذیبوں کی بنیاد رکھنے والی مغربی نسلوں پر پڑتی ہے وہ زمین کے اُن قدیم باشندوں کا ایک دھندلا سا نقشہ بھی ہمیں دکھاتی ہے، جس میں اُن کے بہت سے قبیلے اس سطح مرتفع پر رہتے سہتے دکھائی دیتے ہیں۔ وہ مکمل وحشت سے ترقی کر کے نیم وحشت کے درجے تک پہنچے ہیں اور ایک عالم گیر مجرد ذات کا مبہم سا احساس اُن کے ذہنوں میں تشکل پذیر ہو رہا ہے۔ اب تک وہ خوف کے مارے لرزہ براندام ہو کر جن اشیائے فطری کی پرستش کرتے رہے تھے اُن کی جگہ لاتعداد خیالی ہستیاں لے رہی ہیں۔ بعض قبیلوں کے یہاں مجرد شخصیتوں کا یہ لشکر دو جامع اصولوں کا تابع فرمان ہے، یعنی نور اور ظلمت۔ زندگی اور روشنی کا نقیب آفتاب ایک واحد خدائے رحیم کی علامت بن جاتا ہے، جس کی قوت ابھی مزاحمتوں سے دوچار ہے، لیکن آخر الامر اپنے مخالف اصول، یعنی ظلمت اور شر، پر غالب آجائے گی۔ دوسرے قبیلوں کے یہاں یہ صورت حال ہے کہ وہ اپنے معبود بتوں کو جن خیالی ہستیوں کا جامہ پہنا رہے ہیں وہ خیالی ہستیاں ایک دوسری میں مدغم ہو رہی ہیں۔ کبھی تو وہ جدا جدا شخصیتیں بن کر سامنے آتی ہیں اور کبھی یکجا ہو کر ذی حیات مادے کی ایک وحدت بن جاتی ہیں۔ دھند کے بادل رفتہ رفتہ چھٹ جاتے ہیں اور ہم دیکھتے ہیں کہ شعوب و قبائل بادشاہیوں میں تبدیل ہو گئے ہیں، زراعت نے آہستہ آہستہ راعیانہ مشاغل کی جگہ لے لی ہے، دھاتوں کا استعمال رائج ہو رہا ہے اور ان سب سے زیادہ اہم بات تو یہ ہے کہ ایک افضل و اعلیٰ شخصیت کا بلند تر تصور ذہنوں کے بند دریچے کھول کر بزور داخل ہو رہا ہے۔ تیمورس، ہوشنگ اور دوسرے شاہانِ باستان، جن کے گیت ایک حیرت انگیز قادر الکلامی سے فردوسی نے گائے ہیں، ایک رُو بہ ترقی تہذیب کے اوّلین نشان بردار ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ جس زمانے میں آریوں کے یہاں بادشاہی کا آغاز ہوا اسی زمانے کے لگ بھگ آریائی خاندان کی دو شاخوں میں وہ مذہبی تنازعہ رونما ہوا جس کے نتیجے میں مشرقی شاخ اپنے مرز و بوم سے جلاوطن ہو گئی۔

مغربی آریوں میں ایک معلم نے، جو اپنے مذہب کی کتابوں میں ستانہ زرتشت کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، ایک زبردست انقلاب برپا کر دیا تھا۔ اس تحریک نے جو شدید مذہبی کشمکش پیدا کی اس کے نشان اُن تبرّوں میں ملتے ہیں جو ویدوں کے بھجنوں میں مشرقی آریوں کی نسل و مذہب کے دشمن "جردشتی" پر بھیجے گئے ہیں۔ اِصلاح شدہ مذہب کے بارے میں ان بھجنوں کے لکھنے والوں کا جو ذہنی زاویہ تھا وہ ناموں

کے غیر معمولی توارد سے بھی بڑھ کر اس امر کا قوی ترین ثبوت ہے کہ یہ مذہبی اختلاف ہی خالص آریوں کی دو شاخوں کے علیحدہ ہو جانے کا فوری اور بلاواسطہ سبب تھا۔ اس مذہبی جنگ میں، جو غالباً انسانی تاریخ کی پہلی مذہبی جنگ تھی، مغربی آریوں کے ثنویت مسلک (DUALIST) قبیلے اپنے مشرقی بھائیوں کو، جن کا مذہب تعددِ ارباب (POLYTHEISM) اور وحدت الوجود (PANTHEIM) کی ایک معجونِ مرکب تھا۔ (PARO-PAMISADAE) کی سرحدوں سے باہر نکالنے میں کامیاب ہو گئے۔ مشرقی آریہ ہندوستان پر ٹوٹ پڑے جہاں انھوں نے اصلی سیاہ فام باشندوں کو اپنی آبادیوں سے نکال باہر کیا یا قتل کر دیا یا غلام بنا لیا اور انھیں ہمیشہ اپنے سے کمتر ہستیاں، یعنی داس اور شودر سمجھتے رہے۔ بہرحال ویدوں کے مذہب اور زرتشتی مذہب میں جو اختلاف تھا وہ محض اضافی تھا۔ زرتشتیت مظاہر کی بجائے اُن کے سبب کی پرستش کرتی تھی۔ جہاں تک ویدوں کے دیوتاؤں کا تعلق تھا، اس نے انھیں دیووں کا جامہ پہنا دیا اور دیو پرستوں کو کافر قرار دیا۔ ویدوں کے بھجن لکھنے والوں نے اس کے جواب میں اوستا کے خدا اہورا کو ایک خبیث دیوتا اور دیوتاؤں کا دشمن کہا اور "جرد شتی" پر دل کھول کر سب و شتم کی بوچھاڑ کی۔

پہلا زرتشت کہاں اور کس زمانے میں ہوا، یہ پردۂ لاعلمی میں مستور ہے۔ بہرحال دارا پوش ہستاسپ کے عہد میں اسی نام کا ایک اور معلم گزرا، جس نے پرانی تعلیمات کی تجدید، تدوین اور توسیع کی۔

اگر ہم ایک قدم پیچھے ہٹ کر نگاہ ڈالیں تو ہمیں ہندوستان میں آریائی فتوحات کا سیلاب صدیوں تک مشرق اور جنوب کی سمت بڑھتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ وہ آریائی مذہب جو حملہ آور قدیم وطن سے اپنے ساتھ لائے تھے زیادہ تر دو چیزوں پر مشتمل تھا یعنی اجداد کی ارواح کی پرستش اور مرئی مظاہر میں مجسم قوائے فطری کی پرستش، پنجاب میں روحانی تصور نے مزید نشوونما پائی۔ ویدوں میں ہمیں ترقی کا کارواں آگے بڑھتا ہوا دکھائی دیتا ہے، تاآں کہ ہم اپنشدوں میں ہندوؤں کے مذہبی خیالات کو اپنے اوجِ کمال پر پہنچا ہوا دیکھتے ہیں، اپنشدوں میں روحانی ولولہ اس شدت سے ہے کہ وہ بلند ترین وحدانیت کے قریب جا پہنچتا ہے۔ اپنشد نہ صرف خدا کے نفوذِ مطلق سے بحث کرتے ہیں، جو ایک ایسا تصور ہے جس نے بعد کے زمانوں میں مادی وحدت الوجود کی صورت اختیار کر لی، بلکہ یہ تعلیم بھی دیتے ہیں کہ روحِ مطلق پرم آتما تمام موجودات کی محافظ اور ساری کائنات کی حاکم ہے، وہ انسانوں کے دلوں میں رہتی ہے اور آخر الامر انفرادی روحوں کو لامتناہیت میں یوں جذب کر لیتی ہے جیسے سمندر دریاؤں کو اپنے اندر غرق کر لیتا ہے

جب یہ انجذاب ہو جاتا ہے تو انسانی رُوح پر کالبدِ خاکی میں جو تجربات گزرے ہوتے ہیں وہ اُن سب کا شعور کھو دیتی ہے۔ لیکن انسانی ترقی کی ان دلچسپ دستاویزوں میں بلاشک و شبہ روحانی انحطاط کے جراثیم موجود تھے جنھوں نے بہت جلد ارتقا کے عمل کا رُخ پلٹا دیا۔ چنانچہ مزید عروج کی بجائے ہمیں مسلسل تنزل دکھائی دیتا ہے۔ اُپنشدوں کا مقام پُران حاصل کر لیتے ہیں، اور پھر تنتروں کا طریق پرستش پرانوں کو اس مقام سے ہٹا دیتا ہے۔

اُپنشدوں میں جو خیال بار بار دُہرایا گیا ہے کہ پرم آتما مختلف صورتوں میں جلوہ گر ہوتی ہے اسی سے اوتاروں کا تصور پیدا ہوا۔ جس طرح مغربی غیر اہلِ کتاب کا فلسفۂ کائنات نفسِ عامہ کی اس زبردست خواہش کی تسکین نہ کر سکا کہ اسے ایک ایسا شخصی عامل جائے جو انسانوں میں رہ چکا ہو اور اُن کے ساتھ آئے دن کا میل جول رکھ چکا ہو، اسی طرح اُپنشدوں کے موحدانہ ولولے ہندوستان کے عوام کو جذباتی تشفی بہم نہ پہنچا سکے۔

چنانچہ اُنھوں نے بہت جلد کشتری جاتی سے ایک ہیرو لیتا ڈھونڈ نکالا، جس کے متعلق تھوڑی مدت کے بعد یہ عقیدہ رائج ہو گیا کہ وہ بنفسہٖ پرماتما تھا اور پرمیشور کا اوتار بن کر اس سنسار میں زندگی بسر کرنے آیا تھا۔

کرشن بھگتی کو اپنے حریف کالی پوجا کی طرح جو عام مقبولیت حاصل ہوئی وہ نہ صرف اس امر کی پُرزور شہادت دیتی ہے کہ ساتویں صدی عیسوی میں ہندوستان کیسی مذہبی ابتری میں مبتلا تھا، بلکہ اُس وسیع خلیج کو بھی نمایاں کرتی ہے جو اُپنشدوں اور بھگوت گیتا[1] کے لکھنے والے فلسفیوں کے ذہنوں اور عوام کے جذبات و خیالات کے درمیان حائل تھی۔ یہ بات پوری طرح واضح ہے کہ اُس علاقے میں داخل ہونے سے پہلے جسے صحیح معنوں میں ہندوستان یا آریہ ورت کہا جاتا ہے۔ ان آریوں نے جو پنجاب میں آباد تھے یا اُن کے پروہتوں اور مذہبی معلموں نے بہت سخت قاعدے وضع کیے تھے جن کا مقصد یہ تھا کہ آریوں نے اپنے طول طویل فاتحانہ کوچ کے دوران جن قوموں کو مطیع و منقاد بنایا تھا۔ ان میں خلط ملط نہ ہو جائیں۔

---

[1] زمانۂ حال کا ایک مصنف کہتا ہے کہ بھگوت گیتا میں بے شک وحدانیت کے نشان پائے جاتے ہیں لیکن وہ غیر موحدانہ عناصر کے ساتھ مخلوط ہیں۔

ان قوموں کو سماج کے اسفل ترین طبقے میں جگہ دی گئی، ان کو اچھوت قرار دیا گیا اور جو مذہبی رسومات اونچی ذاتوں کے لیے مقرر تھیں وہ ان کے لیے سختی سے ممنوع کر دی گئیں۔

وحدت الوجود کے موضوع پر آریائی ہندو فکر میں جو مدوجزر آئے ہیں اُن سب کے دوران ارواح اسلاف کی پرستش مذہبی و معاشرتی نظام کا ایک لازمی جزو بن کر ہندوؤں کے ذہنوں میں جمی رہی ہے یوں تو شودروں کو بھی اجازت تھی کہ اپنے آباؤ اجداد کی ارواح پر چڑھاوے چڑھائیں، لیکن اگر کوئی برہمن اُن کی پوجا میں شریک ہوتا تو اُسے بڑی سنگین سزا دی جاتی۔ اگر کوئی شودر اتفاقاً کسی برہمن کو منتر پڑھتے ہوئے سُن پاتا تو اس کے لیے یہ سزا مقرر تھی کہ اُس کے کانوں میں پگھلا ہوا سیسہ ڈال دیا جائے: اگر وہ کسی برہمن کے برابر چوکی پر بیٹھ جاتا تو اس کے بدن کو لوہے سے داغ دیا جاتا۔ شودروں اور اونچی جاتیوں کے لوگوں کی آپس میں شادیاں انتہائی بےرحمانہ سزاؤں کی مستوجب اور قطعاً ممنوع تھیں لیکن کسی قسم کی قانونی پابندیاں بھی آریوں کے مذہبی افکار و عبادات کو اصلی باشندوں کے عقائد کا اثر قبول کرنے سے نہ روک سکیں۔ مرور زمانہ کے ساتھ غیر آریہ قوموں اور قبیلوں کے دیوتا ہندوؤں کی دیومالا میں داخل ہو گئے اور ان کی پوجا ہندوؤں کی آئے دن کی رِیتوں میں شامل ہو گئی۔ بھانت بھانت کے بختہ اور خام، نئے اور پرانے عقیدوں کے گڈمڈ ہو جانے کا نتیجہ ناگزیر طور پر یہ ہوا کہ فلاسفہ صدیوں سے جس پیچیدہ اور دقیق وحدت الوجودی نظام خیال کے ارتقا میں مصروف تھے اس میں ابتذال آ گیا۔

جب تک تابعین اسلام نے وہ پردہ نہ اٹھایا جس کے پیچھے ہندوستان ہزاروں سالوں سے ایک پُراسرار زندگی بسر کر رہا تھا، اس وقت تک ہندوستان کی کوئی تاریخ نہ تھی۔ یہ کہنا ناممکن ہے کہ واسودیو کرشن کس زمانے میں گزرا یا اس کی شخصیت کیسی تھی۔ اس کے بارے میں ان گنت کہانیاں ہیں، جو بے سروپا اور لچر معلوم ہوتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ کہانیاں برہمنوں نے گھڑی ہیں، جو دیوتاؤں سے اونچے نہیں تو اُن کے ہمسر ضرور بن گئے تھے اور جن کا فائدہ اس میں تھا کہ عوام کے دلوں کو لبھائے

ل سری کرشن کو عموماً گوپال کرشن (یعنی کرشن گوالا) کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اُن کی سہیلیوں کو گوپیوں (یعنی گوالنیں) کہا جاتا ہے۔ اہیروں، یعنی شمال ہند کے گوالوں، کے اس شوریدہ دیوتا کے بارے میں بہت سی پُرلطف کہانیاں مشہور ہیں بعض لوگوں نے اسے ہندوستان کے اپالو (Apollo) کا لقب دیا ہے، لیکن یہ لقب کچھ پھبتا نہیں۔

اور رچھائے رکھیں ۔ واسودیو کرشن کو ہندو دیومالا میں وشنو کے اوتار کا مقام حاصل ہے اور اس حیثیت سے وہ بھگوت گیتا کے اس حصے کی جو بھکتی سے تعلق رکھتا ہے مرکزی شخصیت ہے۔ وہ بدیہی طور پر ایک جامع شخصیات دیوتا ہے ؛ اس کی ایک شخصیت وہ منش دیوتا، وہ رنگیلا کنھیا ہے جو گوکل کے گوالوں میں رہتا تھا اور برندابن کے مشہور کنجوں میں اپنی سجیلیوں کے ساتھ لیلا رچا کر اپنا جی بہلاتا تھا۔

واسودیو کرشن کے مسلک کا بنیادی رکن یہ تھا کہ پورا پورا دھرم یعنی ایمان مکتی یعنی نجات کی کنجی ہے۔ جو کوئی وشنو کے اس اوتار پر ایمان لے آتا۔ اس کے اعمال چاہے کیسے ہی ہوتے اُسے ابدی سعادت کا نصیب ہونا یقینی تھا۔

اس کامل ایمان کے نظریے نے بعض ایسی رسمات اور عقائد کو جنم دیا جو اب تک ہندوستان میں رائج ہیں۔ چونکہ پارسائی اس پر مشتمل سمجھی جاتی تھی کہ کرشن کو پرماتما سمجھ کر اپنے من میں بسا لیا جائے۔ اور پھر اپنے من سے پوری پوری لو لگائی جائے، اس لیے عام لوگ بیراگ اور سنیاس کو مہان تصور کرنے لگے۔ آنکھیں اپنے بدن کے کسی ایک حصے پر جما کر اور من کو کرشن جی سے لگا کر سالہا سال تک جنگل میں بیٹھا رہنا، برسوں تک ایک ٹانگ پر کھڑا رہنا ؛ بدن میں آنکڑے گڑوا کر ادھر اُدھر گھسٹتے پھرنا یہ سب ایسے کام تھے جو سب پاپ دھو ڈالتے تھے۔ اگر کسی شخص کو کسی گناہ کا کفارہ دینا یا کوئی منت ماننا منظور ہوتا تو وہ کسی آدمی کو کچھ دان دے کر اس کام پر لگا دیتا کہ وہ اس کے گھر سے دیوتا کے مندر تک کا راستہ اپنے بدن کی لمبائی سے ماپتا ہوا چلا جائے۔

بھگوت گیتا کا پورے دھیان کے ساتھ پاٹھ کرنے سے یا گنگا جل میں اشنان کرنے سے ساری بُرائیاں دوش اور پاپ دُھل جاتے تھے۔

شکتی پوجا نے بہت سے ہندوؤں کے دلوں پر جو سکہ جما رکھا ہے وثوق سے کہنا مشکل ہے کہ یہ سکہ اس نے کب جمایا۔ شکتی ہر ہندو دیوتا کا نسوانی نصف اور فعال تخلیقی پہلو ہے۔ شیو جی کی شکتی یا استری وہ بھیانک دیوی ہے۔ جو پاربتی، بھوانی، کالی، مہا کالی، دُرگا، چمپندا اور دوسرے ناموں سے پکاری جاتی ہے۔ اس دیوی کی پوجا، جیسے کہ وہ بھوا بھوتی کے ڈرامے میں، جو غالباً ساتویں صدی عیسوی میں لکھا گیا، بیان کی گئی ہے، انسانی قربانیوں اور دوسری انسانیت سوز رسموں کے ساتھ کی جاتی تھی۔ اسے چاہے کسی نام سے پکارا جائے اور اس کی پوجا چاہے کسی طریقے سے کی جائے، اس میں عیسائی مذہب کی

"مادرِ غمخوار" (MATER DOLOROSA) کی سی کوئی بات نہیں پائی جاتی؛ اسکندریہ کے پجاری آئی سس (ISIS) دیوی کی طرف جو انسانی رحم اور انسانی دکھ درد سے ہمدردی منسوب کرتے تھے اس کا بھی شائبہ تک ہندوؤں کی اس خوفناک دیوی میں موجود نہیں۔ یہ ہیبت ناک بلکہ دہشت انگیز تصور، جو تنزل پذیر مذہبی نفوس کی پیداوار ہے، صریحاً غیر آریہ قوموں سے مستعار لیا گیا، اور یہ ایک ایسا تصور ہے جس کی کوئی نظیر دنیا کے غیر اہلِ کتاب مذاہب میں نہیں ملتی۔ اور تو اور، سبلی (CYBELE) یعنی اہلِ روما کی مادرِ کبریٰ (MONA MAT-ER) بھی اتنی بے رحم اور انسانوں کو دکھ پہنچانے کی اتنی شائق نہ تھی جتنی تباہی کے دیوتا شو کی شکتی تھی۔ اس دیوی کی پوجا تنتروں کی رسومات کے مطابق کی جاتی ہے، جو گویا شکتی دھرم کی بائبل ہیں۔ تنتروں کے بہت سے بھجن بھکتی اور سادھنا سے بھرے ہوتے ہیں، اور دیوی سے جو پرارتھنائیں کی گئی ہیں ان میں اکثر اس سے دیا اور کرپا کی بھیک مانگی گئی ہے۔ لیکن فلسفیوں کے لیے تنتروں میں خواہ کیسے ہی صوفیانہ معانی ہوں، عام لوگ اُن کی بتائی ہوئی پوجا پر لغوا عمل کرتے ہیں[1]۔

ہندوؤں کے دو بڑے حماسوں سے، جن میں سے ایک پانڈوؤں اور کوروؤں کی لڑائی اور دوسرا لنکا کے راجہ راون کے ہاتھوں سیتا کے اغوا کی کہانی بیان کرتا ہے، ہمیں کافی وضاحت کے ساتھ پتہ چل جاتا ہے کہ اُس زمانے میں کس قسم کے مذہبی عقیدے اور طریقے عوام میں رائج تھے۔ دونوں حماسوں میں ایک خاصے ارتقا یافتہ معاشرے کا نقشہ کھینچا گیا ہے، جس میں کافی مادی ترقی ہو چکی تھی، لیکن ساتھ

---

[1] تنتری پجاریوں کے دو بڑے بڑے گروہ ہیں۔ دکھنا چاری اور برہمچاری، یعنی دائیں ہاتھ کی اور بائیں ہاتھ کی ریتوں پر عمل کرنے والے۔ دکھنا چاریوں کی پوجا کھلے طور پر ہوتی ہے اور اس میں دوسری دیویوں، مثلاً وشنو دیوتا کی شکتی لکشمی یا مہا لکشمی سے بھی خطاب کیا جاتا ہے۔ برہمچاری کی پوجا میں، جسے خاص طور پر تنتر یکا کہا جاتا ہے، کالی دیوی بلا شرکتِ غیرے معبود ہوتی ہے۔ یہ پوجا تنہائی میں کی جاتی ہے اور کہا جاتا ہے کہ اس میں بہت سی ناپاک رسمیں ہوتی ہیں۔ سارے ہندوستان میں برہمچاری فرقے کے پیروؤں کی تعداد میں پائے جاتے ہیں، اور اس کی بے شمار شاخیں ہیں۔ درگا پوجا میں، جو عموماً اگست کے مہینے میں منائی جاتی ہے، درگا کی مورتی کو سنگھاسن پر بٹھا کر جلوس نکالے جاتے ہیں۔ شمالی ہندوستان میں اس مورتی کو ہلدیہ رنگ میں رنگا جاتا ہے۔ بنگال میں اس کی مورتی بالکل کالی ہوتی ہے، اس کے چار ہاتھ ہوتے ہیں اور وہ شیر پر سوار ہوتی ہے۔ کالی گھاٹ (جس سے کلکتہ کا نام پڑا) کے مندر میں دیوی خونچکاں سروں کی ایک مالا پہنے ہوتی ہے۔ جے پور کے ایک مندر میں دیوی کا سر پیچھے کو مڑا ہوا ہے۔ روایت ہے کہ انسان کی بجائے اُسے بکری بھینٹ چڑھائی گئی تو اُس نے گھن کے مارے منہ پھیر لیا۔

ہی ساتھ اخلاقی انحطاط بھی بہت بڑھ چکا تھا۔ چنانچہ بدھ مت کے بانی گوتم بدھ کے ظہور سے بہت مدت پہلے ہندوستان کے عوام میں مذہبی عبادت محض بلیدانوں اور چڑھاووں کا ایک رسمی مجموعہ بن کر رہ گئی تھی جس میں ثواب کا معیار پوجا کرنے والے کی نیکی یا پرہیزگاری نہیں بلکہ پروہت (جس کے بغیر ان رسموں کا ادا کرنا سرے سے ممکن ہی نہ تھا) کی یہ صلاحیت ہوتی تھی کہ وہ مناسب جنتر منتر پڑھ کر دیوتا کو دعا قبول کرنے پر مجبور کر سکے۔ گوتم بدھ اور مہاویر نے جو بغاوت کی وہ خود غرض پروہتوں کے اقتدار کے خلاف ہندوؤں کے دل سے اٹھنے والی ایک آواز تھی۔ دونوں مذہبی پیشوا اس کے منکر ہیں کہ اس کائنات کا کوئی خالق ہے یا اس پر کوئی ایسی عقل کل حکمراں ہے جو اس کا نظام چلا رہی ہے۔ لیکن دونوں یہ اعلان کرتے ہیں کہ انفرادی زندگی بالآخر معدوم ہو جائے گی اور دونوں یہ کہتے ہیں کہ یہ نیک انجام صرف اچھے کاموں کے ذریعے حاصل ہو سکتا ہے۔ لیکن ان میں ایک فرق ہے۔ جین مت تو ہندو مت سے وابستہ رہا ہے۔ اور اب عملی طور پر برہمنوں کے مذہب کا ایک فرقہ بن گیا ہے۔ لیکن بدھ مت نے جرأت سے کام لے کر ایک نئی روش کی داغ بیل ڈالی اور اس پر چل نکلا۔ اس نے کرم یعنی عمل کو نجات کا واحد وسیلہ قرار دیا اور اس کے جلیل المرتبت بانی نے عمر بھر عمل کے میدان میں جد و جہد کی۔ موت کے بعد انسان کی تقدیر کے بارے میں بدھ مت کا جو تصور تھا وہ برہمنی نظریوں کی عین ضد تھا، اور اس کا سری تصوف بہت جلد دوسرے مذاہب میں سرایت کر گیا۔ لیکن اپنی جنم بھومی میں ایک مختصر مگر شاندار زندگی بسر کرنے کے بعد بدھ مت انتہائی مصائب سے دوچار ہوا۔ ظفر مند برہمن دھرم نے اُسے جو سنگین سزائیں دیں اُن کی روداد جنوبی ہندوستان کے مندروں کی دیواروں پر منقوش دکھائی دیتی ہے۔ بہر حال یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ اپنی اصلی صورت میں بدھ مت وہ کشش نہ رکھتا تھا جس کی بدولت برہمن دھرم نے اپنے پیروؤں کے دل موہ لیے۔ اس نے کبھی ایک مثبت دین ہونے کا دعویٰ نہ کیا۔ اُس کی جزائیں اور سزائیں، آئندہ زندگی میں راحت و سعادت کے وعدے، اس زندگی میں فرائض ادا کرنے کے تقاضے، سب اتنے مبہم تھے کہ عام لوگوں کے دلوں پر ان کا کوئی اثر نہ ہو سکتا تھا۔ بہت جلد اس کے لیے ضروری ہو گیا کہ یا تو خارجی دنیا سے مقابلہ ترک کر دے یا جس مذہب کی جگہ لینے کی اُس نے کوشش کی تھی اس سے سمجھوتہ کرے۔ چنانچہ اُسے اپنے پیروؤں کو یہ اجازت دینی پڑی کہ نیک کاموں کو چھوڑ کر پوجا پاٹ میں مگن ہو جائیں یا اس کی بے لطف تعلیمات میں دلچسپی پیدا کرنے کے لیے تحریک رسومات اختیار کریں

اُسے اپنے اصلی وطن میں نہایت موافق حالات کے تحت جو ناکامی ہوئی اس نے اس کی کوئی گنجائش نہ چھوڑی کہ وہ اپنے آپ کو ایک ولولہ انگیز مذہبی نظام ثابت کر سکے، اگرچہ یہ درست ہے کہ اُس کے بعض صوفیانہ پہلو مغربی ایشیا اور مصر کے فلسفوں پر بڑی حد تک اثر انداز ہوئے ہیں۔

بدھ مت کے ہندوستان سے دیس نکالے کے بعد برہمن دھرم نے دوبارہ غلبہ حاصل کر لیا۔ جس زمانے میں بدھ مت کا راج تھا اُس زمانے میں برہمن دھرم نے جو بُرے دن دیکھے تھے اُن سے اس نے کوئی سبق نہ سیکھا تھا: اُس کے رُوحانی تصورات میں کوئی اصلاح نہ ہوئی تھی۔ چنانچہ وہ بیجان رسم پرستی جس کے خلاف مہاتما بدھ نے بغاوت کی تھی آگے سے بھی زیادہ استوار بنیادوں پر از سرِ نو قائم ہو گئی۔ بحال شدہ برہمن راج میں لوگوں کی زندگیوں پر ایک ایسے مذہب کا آگے سے بھی کڑا پہرہ لگ گیا جو محض قربانیوں کا ایک سلسلہ تھا۔ یہ مذہب لوگوں کے رُوحانی تقاضوں کی تو کیا تسکین کرتا، البتہ وہ اُن کے حواس اور غالباً اُن کے جذبات کو بھاتا تھا۔ عام لوگوں کی مذہبی عبادت بے معنی اور بیہودہ رسموں کا ایک روزانہ چکر بن گئی۔ ان کے معبود پروہت تھے، اگلوں کی رُوحیں تھیں اور محض ظاہرداری کے طور پر ویدوں کے دیوتا تھے۔ ہندوستان کے اصلی باشندوں سے جو بُت پرستی ہندوؤں نے سیکھی تھی اُسے نہ اُن کا فلسفہ نہ بدھ مت کی اخلاقی تعلیم مٹا سکی۔ اُس نے اب تمام جاتیوں کی اندرونی زندگی میں گھر کر لیا۔ درخت، پتھر دوسری اشیائے فطری اور بُت، جو گھروں اور خاندانوں کے دیوتاؤں اور پرانے دیوتاؤں کی علامتی مُورتیاں تھے، عام لوگوں کے معبود بن گئے۔ منو کا دھرم شاستر، جس پر ہندوؤں کو بجا طور پر فخر ہے اور جو بعد کے زمانوں میں دوسری مشرقی اقوام کے قانونی نظریوں کا نمونہ بنا ایک ایسی مملکت کا ضابطۂ آئینی ہے جس میں ایک طرف تو مادی تہذیب بڑی ترقی کر چکی تھی اور دوسری طرف پروہتوں کے طبقے کا مطلق اقتدار اور عوام میں ایک تعجب انگیز اخلاقی انحطاط تھا۔ پروہتوں کی طرح اب راجہ بھی دیوتا بن گیا تھا۔ دوسری صدی عیسوی میں، اگرچہ منوسمرتی کی اب بھی عزت کی جاتی تھی اور اُسے ہر معاملے میں حتمی سند سمجھا جاتا تھا۔ لیکن اس کی جگہ دھیان گرو بجنولکیہ کی تفسیر نے لے لی۔ اُس کے نزدیک ذات پات کا فرق اتنا ہی پتھر کی لکیر تھا جتنا منو کے نزدیک تھا۔ دونوں کی نگاہوں میں شودر اُتنے ہی نیچے تھے جتنے وہ ابتدائی زمانوں میں سمجھے جاتے تھے۔

نوزائیدہ بچیوں کو مار ڈالنے کی رسم ہندوؤں میں اتنی ہی عام تھی جتنی دورِ جہالت کے عربوں میں تھی۔

اِس کا کوئی تحریری ثبوت نہیں ملتا کہ ستی کی رسم کب شروع ہوئی، لیکن قرائن بتاتے ہیں کہ وہ ساتویں صدی عیسوی میں عام تھی۔ بہرحال بیوائیں یقیناً جیتے جی چِتا میں جل جانا خوشی سے قبول کرتی ہوں گی۔ کیونکہ اگر اُن کے اولاد نہ ہوتی تو اُن کی زندگی اجیرن ہوتی تھی۔

عورتوں کو اجازت نہ تھی کہ ویدوں کا پاٹھ کریں یا اگلوں کی رُوحوں کو جو بھوگ دیے جاتے تھے اُن کے دینے میں شریک ہوں یا دیوتاؤں کو جو بھینٹیں چڑھائی جاتی تھیں اُن کے چڑھانے میں شمولیت کریں۔ استری کا دھرم یہی تھا کہ اپنے ناتھ کی سیوا کرے، اور اس کا جگ جگ کا سُکھ چین اسی فرض کے ادا کرنے پر منحصر تھا جو باوفا عورت اپنے سوامی کی چِتا میں جل کر ستی ہو جاتی تھی۔ اُسے ہندو مذہب کے تمام پیرو اپنے دل میں جگہ دیتے تھے اور صنفِ نسواں کے بہترین اور برگزیدہ ترین افراد میں شمار کرتے تھے، بلکہ اکثر اُسے دیوی بنا کر اُس کی پُوجا کرتے تھے۔

اگرچہ سوچ بچار کرنے والے لوگوں کو ہندو مذہب کی اُن رنگین رسموں میں کوئی گہرے معانی نظر نہ آتے تھے اور اُن کی رُوحیں ان رسموں سے بلند تر فضاؤں میں پرواز کرتی تھیں، لیکن کسی فلسفی یا پنڈت نے بیس اور عموماً نو عمر بیواؤں کی ان ظالمانہ قربانیوں پر نفرت یا غصے کا اظہار نہ کیا۔ بہت سی دھرم سبھائیں وجود میں آگئی تھیں۔ جن میں مرد بھی شریک ہوتے تھے اور عورتیں بھی شریک ہوتی تھیں اور جن کی امتیازی صفات میں پاکبازی شامل نہ ہوتی تھی۔ تجرّد کی زندگی بسر کرنے والی بہت سی منڈلیاں بھی بن گئی تھیں، جو مختلف دیوتاؤں کو پُوجتی تھیں۔ ان کے اراکین ہمیشہ دھرم شالاؤں میں جمع ہوتے تھے۔ جن میں عورتوں کو بھی داخلہ دیا جاتا تھا ان منڈلیوں میں اور اسی طرح جوگیوں اور سنیاسیوں کی اُن منڈلیوں میں جو اس زمانے کے لگ بھگ وجود میں آئیں۔ کنوارپن کا بچن محض دھوکے کی ٹٹی تھا اور پالنے کی خاطر نہیں بلکہ توڑنے کی آسانی کی خاطر دیا جاتا تھا جوگیوں کے تبعۃً مندروں اور مقبروں میں مزے کی زندگی بسر کرتے تھے۔ بہت سے بیراگی اور سنیاسی قرونِ وسطیٰ کے بھیک منگے راہبوں کی طرح یا فلیولیس (FLAYIGS) کے عہد کے تارک الدنیا کابیسوں (CYNIGS) کی طرح عقیدت مند لوگوں سے خیرات لے کر ثواب کمانے کی خاطر ادھر اُدھر پھرتے رہتے تھے۔ خیرات دینے والوں کی نظروں میں ان کی سندِ استحقاق کیا ہوتی تھی؟ — اُن کے گندھے ہوئے لمبے لمبے بال، اُلجھی ہوئی گھنی داڑھی، گیروے رنگ کا کُرتا، بھبوت ملا ہوا بدن، کشکول اور ڈنڈا۔

چونکہ دیوتا ناچ اور گانے کے رسیا ہوتے تھے، اس لیے مندروں میں بہت سی ناچنے گانے والی عورتیں آتی

تھیں، جو نام کو تو دیوداسیاں کہلاتی تھیں لیکن دراصل پروہتوں کے آنند کے لیے رکھی جاتی تھیں۔ عورتوں کو شروع شروع کے قوانین میں بہت پست درجہ دیا گیا تھا۔ منو نے عورتوں کے بارے میں جو نفرت و ملامت سے بھرے ہوئے الفاظ لکھے ہیں اُن کی نظیر صرف عیسوی سینٹ ٹرٹلین (TERTULLIAN) کے تعصب آمیز اقوال میں ملتی ہے۔ منو کہتا ہے "عورتوں میں ناپاک خواہشیں ہوتی ہیں: وہ ارادے کی کچی اور چال چلن کی خراب ہوتی ہیں۔ ضروری ہے کہ انھیں دن رات کڑی نگرانی میں رکھا جائے۔"

جہاں تک شودروں کا تعلق تھا، اُس نے تقریباً (PANDECTS) کے الفاظ میں اعلان کیا کہ خدا نے انھیں غلام پیدا کیا ہے اور اگر کوئی شودر غلامی سے آزاد کر بھی دیا جائے تو بھی وہ آزاد نہیں ہوتا۔ چونکہ غلامی اس کی فطرت میں ہے، اس لیے اُسے کون اس سے چھٹکارا دلا سکتا ہے؟

اجمالاً یہ تھے آریہ قوم کی ایک سب سے زیادہ ترقی یافتہ شاخ کے مذہبی و معاشرتی حالات اُس وقت جب پیغمبرِ اسلام نے اپنا پیغام دُنیا کو دیا۔

آیئے اب ہم ایران پر ایک نگاہ ڈالیں۔ ایران ہماری سنجیدہ توجہ کا مستحق ہے، ایک تو اس لیے کہ وہ اسلام کے مرزبوم سے اتنا قرب رکھتا ہے اور دوسرے اس لیے کہ اُس نے نہ صرف دینِ مُوسوی اور دینِ عیسوی کے مزاج پر بلکہ فکرِ اسلامی پر بھی بہت گہرا اثر ڈالا ہے۔

مغربی آریہ ایک قوم کی صورت میں متحد ہو کر اور رُوحانی نشوونما کے مدارج طے کر کے اپنے قدیم وطن کی حدود سے باہر نکل پڑے اور اُن علاقوں میں جو آج کل ایران اور افغانستان کہلاتے ہیں پھیل گئے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ان علاقوں میں حامی اور کُوشی (KUSHITE) نسلوں کے جو باشندے تھے انھوں نے اُن کو مسخر کر لیا یا تباہ کر دیا اور رفتہ رفتہ بحیرۂ خزر تک جا پہنچے، جہاں وہ حامیوں اور کُوشیوں سے زیادہ مضبوط اور جفاکش تورانیوں سے دوچار ہوئے۔ جو ماد اور شوسیانہ (SUSIANA) میں آباد تھے۔ لیکن اس سے پیشتر کہ وہ تورانیوں کو محکوم بنا تے وہ خود ایک غیر ملکی حملہ آور کے حلقہ بگوش ہو گئے، جو یا کُوشی تھا یا اشوری (اغلب ہے کہ اشوری تک) اور بڑی مُدّت تک اس کے زیرِ فرمان رہے[1]۔ ان غیر ملکی

---

[1] ایرانی روایات کے مطابق ضحاک نے ایک ہزار سے زیادہ سالوں تک ایران پر حکومت کی۔ بہت سے محققوں نے اشوریوں کے اقتدار کی بھی یہی مُدّت بتائی ہے۔ اگر یہ خیال صحیح ہے تو فریدون کا خروج اور نینوا کا سقوط دونوں ایک ہی زمانے میں ہوئے۔

فاتحین کے نکال دیئے جانے کے بعد ایرانیوں اور تورانیوں کی وہ جنگ شروع ہوئی جس میں کبھی ایک فریق غالب آجاتا تھا اور کبھی دوسرا اور جو صدیوں تک جاری رہنے کے بعد ماد اور سوسیانہ (SUSIANA) میں تورانیوں کے محکوم بن جانے پر ختم ہوئی[1] افراسیاب اور کیکاؤس کے پیروؤں کو رزم و بزم میں ایک دوسرے سے بسا اوقات جو سابقہ پڑا اُس نے ایرانیوں کے مذہب پر ایک دائمی اثر ڈالا۔ تورانیوں کی انتہائی مادیت اُن کے ایرانی حریفوں اور ہمسایوں کی ناپختہ تصوریت میں پستی پیدا کیے بغیر نہ رہی ایرانیوں نے ماد کے قدیم آباد کاروں پر غلبہ تو پالیا، لیکن تورانیوں کے طریقہ ہائے پرستش اُن کے مذہب میں داخل ہو گئے۔ چنانچہ جہاں ایران میں صرف ہرمزد کی پرستش کی جاتی تھی اور اہرمن کو ملعون سمجھا جاتا تھا، وہاں ماد میں خیر و شر کے اُن دونوں نمائندوں کی پوجا کی جاتی تھی۔ تورانی باشندوں کا ایرانی فاتحوں کے خدا کی بہ نسبت اپنے قومی دیوتا کی پرستش کی طرف زیادہ راغب ہونا ایک قدرتی امر تھا۔ چنانچہ تورانی عوام اہرمن یا افراسیاب کو ہرمزد پر ترجیح دیتے تھے

مادیوں اور بابلیوں کا ایک تعاونی معاہدے کی بدولت، جو تاریخ میں اپنی قسم کا پہلا معروف معاہدہ ہے۔ اشوری سلطنت کا تختہ اُلٹ گیا۔ لیکن اشوری مذہب بہت سے ایسے علاقوں پر جو آریوں نے فتح کیے۔ آتنی مدت تک مسلط رہ چکا تھا کہ زرتشتیوں کے تصورات پر اس کے نقوش کا ثبت رہنا ناگزیر تھا۔ سماوی رابطہ بندیوں اور ایک مقدس سلسلۂ مراتب کا جو پیچیدہ تصور اشوریوں میں رائج تھا اس کا پیوند زرتشتی مذہب میں لگ گیا۔ اب ہرمزد کی ایک اشور ثانی کے طور پر پرستش ہونے لگی، اور ایرانیوں نے روشنی کے خدائے مہربان کو مجسم کرنے کے لیے جو علامتی نشان منتخب کیا وہ اشوریوں کا ایک پردار سپاہی تھا، جو ہاتھ اوپر کو اٹھائے اور ایک کمان تھامے سنسار چکر میں مصور کیا گیا تھا۔ اُن کے یہاں جو جھاڑ نشو و نما کی علامت تھا پہلے اس کی اُوپر کو اُٹھی ہوئی شاخیں مل کر صنوبر کے پھل کی شکل بناتی تھیں، اب وہ سرو کے پھل کی شکل بنانے لگیں۔ اس سے قبل کہ کسریٰ نے آ کر فتوحات کے ذریعے مملکت کو سالمیت بخشی ابتدائی مہاجروں اور آبادکاروں میں جو علامتی پرستش رائج تھی وہ عوام کے یہاں بگڑ کر آتش پرستی بن گئی یا اس نے کلدانیوں اور اشوریوں کے صابی مذہب کی صورت اختیار کر لی۔

---

[1] LERMONT, ANCIENT HISTORY OF THE CAST, P. 54.

آشور کا شہر جس نے تقریباً ایک ہزار سال سرحدِ ہندوستان تک سارے مغربی ایشیا پر حکومت کی تھی اور جس کے زیرِ فرمان آنے سے فراعنۂ مصر کی سلطنت بال بال بچی تھی، طاقت ور سارگون اور عظیم سنحریب (SANNACHERIB) کا شہر بابلیوں اور مادیوں کے مجموعی لشکروں کے ہاتھوں زیر ہو چکا تھا اور ایسے طور پر زیر ہو چکا تھا کہ پھر اُسے اقوامِ عالم میں سر اُٹھانا نصیب نہ ہوا۔ بابل جو شروع شروع میں نینوا کا حریف رہ کر اشوریہ کے زیرِ نگیں آ گیا تھا، پھر ایک بار ایشیائی تہذیب کا مرکز بن گیا۔ اُس نے اُن تمام علوم و فنون کو جو ایک ہزار سالوں کی نشوونما کا حاصل اور "قوموں، مذہبوں، مندروں اور پروہتوں کے اختلاط کا نتیجہ تھے" اپنے دامن میں سمیٹ لیا اور زمانۂ سلف کے بیجان مذہبوں اور جدید اعتقادات کے درمیان رابطے کی کڑی بن گیا۔ اشوریہ نے اکادیوں سے نہ صرف اُن کا تمدن اور ادب حاصل کیا تھا بلکہ اُن کے مذہب سے بھی بہت کچھ اکتساب کیا تھا۔ بابل، جس کی عظیم تر شان و شوکت نے نینوا کی خاکستر کے اندر سے جنم لیا تھا، ایک ایسے مذہب کا علمبردار تھا جو اشوری اور کلدانی مذہبوں کا نچوڑ تھا۔ بنوخذ نصر (بخت نصر) کے عہدِ حکومت میں بابل کی سلطنت اپنے اوجِ اقتدار کو پہنچ گئی۔ یہودیہ اس کی قلمرو میں آ گیا اور اُس کے چیدہ و برگزیدہ لوگ غلام بنا کر بابل میں منتقل کر دیے گئے تاکہ اس کے دریا کے کنارے بیٹھ کر یہودہ کی بادشاہی کا ماتم کریں۔ یہ طاقتور فاتح عرب میں بھی داخل ہو گیا اور وہاں اس نے بنی اسماعیل کو مسخر کر کے قریب قریب تباہ کر دیا: اُس نے مصریوں کو بھی زبردست ضربیں لگائیں اور فراعنۂ مصر کی قوت کا بھی خاتمہ کر ڈالا۔ اگرچہ عبرانی وطن پرست دل کھول کر بابل پر لعنتیں بھیجتے ہیں، تاہم بابل نے یہودیوں پر اتنی سختیاں نہیں کیں جتنی مصر نے کیں۔ بنی اسرائیل خود اُس فیاضانہ سلوک کی شہادت دیتے ہیں جو اُن سے کیا گیا۔ جب تک نجات دہندہ (یعنی حضرتِ موسیٰؑ) نے ایک جری لشکر لے کر اس بدنصیب شہر پر چڑھائی نہ کی اُس وقت تک بنی اسرائیل نے بابل کے خلاف کوئی آواز بلند نہ کی۔ لیکن جب انھیں رہائی مل گئی تو انھوں نے سب و شتم، بددعاؤں اور ملامت و نفرین کا وہ ہنگامہ برپا کیا جو نسلِ عبرانی کے دورِ وحشت کا خاصہ تھا "بابل کے دریاؤں کے کنارے ہم بیٹھ گئے اور صیہون کو یاد کر کر کے روئے۔ اے دخترِ بابل! خوش نصیب ہوگا وہ شخص جو تیرے نوزائیدہ بچوں کو پتھروں پر پٹک دے گا"[1] بنوخذ نصر کے عہدِ حکومت میں بابل بلاشک و شبہ اس

---

[1] Ps. CXXXVII

دور کی تمام تہذیبوں کا مرکز تھا اور اُس کے پروہتوں کو جو اثر و نفوذ حاصل تھا وہ بابلیہ کی سلطنت کے خاتمے کے ساتھ ختم نہ ہوگیا۔ یہودی نظام پر بھی اور عیسوی نظام پر بھی بابلی تصورات کے نقوش نمایاں طور پر ثبت نظر آتے ہیں۔ یہودیوں نے کلدانی موبدوں کے درمیان غریب الوطنی کی جو طویل زندگی گزاری، بعض عبرانیوں کو شاہِ بابل کے دربار میں جو رسوخ حاصل ہوا اور دونوں قوموں میں ناگزیر طور پر جو میل جول ہوا، اُن سب نے یکجا ہو کر قرونِ اخریٰ کی یہودیت کا مزاج بدل دیا۔ جب یہودی قیدی بنا کر بابل لے جائے گئے تو وہ نیم وحشی تھے۔ جب وہ دیارِ غربت کی طویل آزمائشوں کے بعد صیہون لوٹے تو وہ ایک ایسی قوم بن چکے تھے جو نظریات و عقائد میں ترقی یافتہ، بڑھے ہوئے حوصلوں سے مملو اور ایک وسیع تر سیاسی بصیرت کی مالک تھی۔ (باقی آئندہ)

مسلمانوں کے عقائد و افکار

(حصہ اول)

مقالات الاسلامیین

علامہ ابوالحسن اشعری — ترجمہ مولانا محمد حنیف ندوی

علامہ ابوالحسن اشعری چوتھی صدی ہجری کی وہ جلیل القدر شخصیت ہیں جنھوں نے مسلسل چالیس برس تک اعتزال و جہمیت کی فتنہ سامانیوں کا شکار رہنے کے باوجود اپنے لیے فکر و تعمق اور اجتہاد و کلام کا ایک علیحدہ اور منفرد دبستان سجایا۔

"مقالات الاسلامیین" ان کا وہ علمی شاہکار ہے جسے افکار و نظریات کا انسائیکلوپیڈیا کہنا چاہیے اس میں علامہ نے چوتھی صدی ہجری کے اوائل کے اُن تمام عقائد اور افکار کو بغیر کسی تعصب کے بیان کر دیا ہے جو صدیوں ہمارے ہاں کے فکری و کلامی مناظروں کا محور بنے رہے۔ اس کے مطالعہ سے جہاں یہ معلوم ہوگا کہ مسلمانوں نے نفسیات اخلاق اور مادہ و روح کے بارے میں کن کن علمی جواہر پاروں کی تخلیق کی ہے وہاں یہ حقیقت بھی نکھر کر سامنے آئے گی کہ ماضی میں فکر و نظر کی کجی نے کن کن گمراہیوں کو جنم دیا ہے۔ اور ان گمراہیوں کے مقابلے میں اسلام نے کس معجزانہ انداز سے اپنے وجود کو قائم اور برقرار رکھا ہے۔ یہ کتاب کے پہلے حصے کا اردو ترجمہ ہے۔

صفحات ۳۸۰ - قیمت ۹ روپے۔

ملنے کا پتہ

ادارہ ثقافتِ اسلامیہ۔ کلب روڈ لاہور